

حضرت معاویہ اور خلافت و ملکیت

الْبلاغ کے خصوصی نمبر پر تبصرہ

(از ملک غلام علی صاحب)

ناظرین ترجمان اس بات سے آگاہ ہیں کہ میں نے ”الْبلاغ“ کے ایک سلسلہ مضامین ”حضرت معاویہ اور خلافت و ملکیت“ کا جواب سپردِ قلم کیا تھا جس کی آخری قسط ربیع الاول ۱۳۹۰ھ (جون ۱۹۷۰ء) کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی۔ آٹھ ماہ گزر چکے کے بعد اب ”الْبلاغ“ کا پھر ایک ۸۸ صفحات کا خصوصی نمبر نکلا ہے جو میرے مضمون کی تردید کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس میں طنز و تعریض اور اکثر و بیشتر سابقہ فرعونیات و استبدالات کی ہنر کے ماسواہ کچھ نہیں ہے۔ میرے بیان کردہ شواہد و دلائل اور میرے اٹھائے ہوئے سوالات سے شاذ و نادر ہی اعتناء کیا گیا ہے۔ تاہم میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تعاقب کا بھی نوٹس لوں اور جن غلطیوں اور مغالطوں پر یہ مشتمل ہے انہیں پھر ایک بار واضح کر دوں۔

تنبہیدی کلمات | مگر اصل بحث سے قبل چند تنبہیدی کلمات ضروری ہیں۔ مولانا مودودی کی تصنیف ”خلافت و ملکیت“ کا مواد ترجمان القرآن میں چھ سال پہلے چھپنا شروع ہوا تھا۔ اسی وقت سے بعض حضرات کی طرف سے اس پر رد و کد اور سب و شتم کا آغاز ہو گیا تھا، لیکن ہم نے اس پورے عرصے میں کبھی باقاعدہ حریف مناظرہ بننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں ذاتی طور پر تمام تنقیدی اور مخالفانہ تحریروں کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور جب مدیر ”الْبلاغ“ کے بقول یہ گرواگر می کچھ دھیمی پڑی تو میں نے خیال کیا کہ اب مولانا مودودی کو ناکارہ گناہ کی سزا کافی مل چکی ہے اور تصویر کا دوسرا رخ پوری طرح سامنے آچکا ہے، اس لیے غالباً اب یہ ہم ختم ہو جائے گی لیکن ۱۹۶۸ء کے اواخر میں مجھے کراچی، سرحد اور کچھ دوسرے مقامات کے بعض رفقاء کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ

جو علمائے کرام جماعت اسلامی کے خلاف سرگرم رہتے ہیں، وہ ان دنوں بہت مسرور ہیں، —————
 ————— کیونکہ ان کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ عنقریب مولانا منقنی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے کی
 طرف سے ایک ایسی چیز منظر عام پر آنے والی ہے جو مولانا مودودی کا سارا جہم کھول کر رکھ دے گی مولانا
 مودودی اور جماعت اسلامی کے بعض دوسرے مخالفین کے اعتراضات اپنے سوتیلے زین اور فحش کلامی کے
 باعث مٹوڑ نہیں ہوتے، لیکن اب جو تنقید آ رہی ہے، وہ بڑی سنجیدہ و مدلل ہے۔

اس کے چند ماہ بعد پہلے ”البلاغ“ میں اشتہار آیا، پھر وہ موعودہ سلسلہ مضامین جاری ہو گیا اور اس کے
 ساتھ ہی یہ ”بیانات“ اور بعض دوسرے پرچوں میں جلی عنوانات کے تحت نقل ہونا شروع ہو گیا، حتیٰ کہ ہندوستان
 میں جمعیت علمائے ہند کے ترجمان ”الجمیعت“ میں بھی اس کی قسطیں چھپنا شروع ہو گئیں۔ نتیجہ پلانی مردہ مہم
 کو نئی زندگی ملی گئی اور ملک بھر بلکہ بیرون ملک سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اس تنقید و تردید کی حقیقت
 واضح کی جائے۔ ”خلافت و ملوکیت“ کی جن عبارتوں کو ”البلاغ“ میں ہدف بنایا گیا ہے، وہ تیرہ یا چودہ
 صفحات سے زائد نہیں ہیں، لیکن ”البلاغ“ نے انہیں آٹھ ماہ تک موضوع بحث بنایا ہے۔ آغاز میں طرز بحث
 مقابلہ گوارا اور نظاہر معقول تھا لیکن تدریجاً اس میں جارحیت کا رنگ نمایاں ہونا چلا گیا، حتیٰ کہ صریح مخالف
 انگریزی سے بھی اجتناب نہ کیا گیا۔ آخر کار دو ڈھائی ماہ تو تفت کے بعد میں نے مجبوراً قلم اٹھایا اور ہر الزام و
 اعتراض کا شافی جواب دے دیا۔ مگر افسوس کہ ”البلاغ“ نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اپنی باتوں کو اس طرح دہرا
 دیا اور میری ہر بات کو اس طرح نظر انداز کر دیا گویا کہ سرے سے کوئی جواب دیا ہی نہیں گیا۔ اس لیے میرے
 لیے اب یہ ناگزیر ہے کہ میں ”البلاغ“ کے تازہ خاص نمبر پر پھر ایک مرتبہ تبصرہ کروں۔

البلاغ کے اس تازہ پرچے کے آغاز میں جو شکایت خاص طور پر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے ”براہ
 راست مناظرہ کے اس ایٹچ سے گفتگو شروع کر دی جہاں مخالفت پر طعن و تشنیع کرنے، فقرے کسنے اور چھیننے
 اڑانے کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی اور جہاں صرف اس کو ہی نہیں، اس کے اکابر کو اور اس کے مدارس کو بھی
 مطعون کرنا زورِ بیان کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔“ پھر فرماتے ہیں ”اگر کسی کو طنز و تعریض کا ایسا ہی ذوق ہو
 تو پھر اشداد کی یہ صنف تھوڑا سا ریاض چاہتی ہے، اس کی نزاکتوں پر قابو پانے کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔“

میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہ اہل زبان میں سے ہوں، نہ مجھے انشا پر دازی و عبارت آرائی کا سلیقہ ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ کوئی نا ملائم یا چھپتا ہوا جملہ مجھ سے صادر ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا خیال یہ بھی ہے کہ فنِ انشاء کی جس صنفِ لطیف میں امامت کا دعویٰ مدیرِ البلاغ نے فرمایا ہے، بلاشبہ اس کے دائرہ نمونے ان کی سابقہ اور حالیہ تنقید میں جا بجا موجود ہیں۔ میں انشاء اللہ کے چل کر ان معصوم طنزیت کے بعض ٹکڑے پیش بھی کروں گا تاکہ جو حضرات اس فن میں سبکدست ہونا چاہیں، وہ ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اکابر بر طعن | پھر یہ عثمانی صاحب کے اکابر کو مطعون کرنے کا جو الزام مجھ پر عائد کیا گیا ہے، معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے؟ تاہم بالفرض اگر مجھ سے یہ قصور ہوا ہو، تو اس پر طلبِ عفو کرتے ہوئے کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ دوسروں کے بھی کچھ اکابر یا بزرگ ہو سکتے ہیں یا سارے اکابر آپ ہی کے حصے میں آتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ہمیشہ فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھا ہے اور دوسروں کے اکابر کے منہ آنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر مجھ جیسا کم سواد شخص جس نے محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بصیرت افروز فتاویٰ سے استفادہ کیا ہے، اُسے ان کے بعض فتوے کتابِ دینت اور ملکِ حنفی سے متطابق معلوم نہیں ہوئے لیکن میں نے ان کے خلاف علانیہ لب کشائی کی جرأت آج تک نہیں کی کیونکہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن دوسری طرف اطفالِ مکتب بھی اٹھ کر تے ٹکھٹ مولانا مودودی پر لے دے شروع کر دیتے ہیں جن کے مطالعہ و تصنیف کی عمر ان اطفال کی عمر سے بہت زیادہ ہے۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ اس تعدی کے بعد تعلق سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے منہ میاں مٹھو بیٹے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، ملک دبیرون ملک سے ہمارے پاس خطوط و پیغامات کا تانا بانا بندھا رہا۔

جو لوگ مولانا مودودی کا لحاظ نہیں کر سکتے وہ اگر مجھے بھی معاف نہ کریں تو اس میں تعجب یا شکایت کی کوئی بات نہیں۔ تاہم یہاں میں ایک مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری کن باتوں کو یہ طنز و تعریض پر محمول کر کے بُرا مان رہے ہیں۔ میری عمر اب تریپن برس کے لگ بھگ ہے اور میری اولاد بھی غالباً اب مدیرِ البلاغ کی ہم سن ہو کر صاحبِ اولاد ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مدیرِ البلاغ کی عمر شاید پچیس تیس

برس کے قریب ہے اور ان کی شادی بھی اُسی دوران میں ہوئی ہے جب وہ خلافت و حکومت پر تنقید کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے انہیں جا بجا مدبرِ البلاغ، مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے مجھے اگرچہ اس میں کچھ تکلف و محسوس ہوتا تھا لیکن میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے اس اندازِ خطاب کو بطیب خاطر قبول فرمایا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ چوک ہو گئی کہ اپنی سادگی و صاف دلی کی بنا پر غالباً کسی ایک ہی جگہ میری نوکِ قلم سے ”عزیز محمد تقی صاحب عثمانی“ کے الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ علم و عقل میں مجھ سے فائق ہی، مگر سال دس کے اعتبار سے چونکہ میں ان سے کم از کم بیس بائیس برس بڑا ہوں، اس لیے اگر نیک نیتی کے ساتھ میں انہیں سلتہ یا اس طرح کے کسی لفظ سے بھی یاد کر بیٹھتا، تو اس میں حاشا و کلامِ تحقیر و تعریض کا کوئی قرینہ نہ ہوتا، مگر معلوم ہوا کہ ”یہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے“ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بطورِ خاص میرا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ ”میں عزیز محمد تقی صاحب عثمانی سے کہتا ہوں...“ پھر اس کے جواب میں فرمایا ہے ”میرے بزرگوار محترم، مطمئن ہیں کہ اپنے اس ”مشفقانہ“ مشورے کے بعد انہوں نے میرے اعتراض کا جواب دے دیا۔ اب اگر کوئی بے ادب یہ سوال کرنے لگے... تو یہ اس کی صریح نالائقی ہے کہ وہ بزرگوں کی بات کیوں بے چون و چرا نہیں مانتا؟ (اس عبارت میں ”واوین“ کے نشانات بھی عثمانی صاحب ہی کے لگائے ہوئے ہیں اور بزرگوار“ کا تفسیر آمیز خطاب بھی مجھے اسی ایک مقام پر عطا کرنا ضروری سمجھا ہے)۔

مجھے تو نہ بزرگوار و محترم بننے یا کھلونے کا شوق ہے اور نہ کسی کو عزیزم کہنے یا ادب لکھانے پر اصرار ہے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تو میں بالکل حق بجانب ہوں کہ ایک طرف تو ان حلقوں کے اصغر بھی دوسروں کے اکابر کے منہ آتے ہیں، اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ ان کی عمر سے متجاوز بھی کوئی انسان بھولے سے عزیزم کہہ بیٹھے تو یہ اسے اپنی شان میں گستاخی خیال کرتے ہیں اور اس وقت جو پہلا سبق وہ دوسروں کو پڑھا رہے تھے، اُسے خود بھول جاتے ہیں کہ ”ظننہ کی گوی خود اپنے اوپر بھی چل جاتی ہے“ اس طرح کے صاحبزادگان جو ابھی سے بزرگی اور بڑائی کے خواب دیکھنے لگے ہیں، انہیں سواتے اس کے اور کیا کہا جائے کہ ”کے آمدی و کے پیر شدی؟“

حوالے میں تبدیلی کا اعتراض بہر کیفیت اب میں نفسِ بحث کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور مولانا عثمانی صاحب نے جن اعتراضات کو دہرایا ہے، ان کا دوبارہ جائزہ لیتا ہوں۔ تو ریشہ مسلم من الکافر کے مسئلے پر جو پانچ سطوح

مولانا مودودی نے لکھی تھیں، انہیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”میں نے اس عبارت پر دو اعتراضات کیے تھے پہلا یہ کہ مولانا مودودی نے آخری جملے (حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اگر اس بدعت کو ختم کیا) میں امام زہری کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس مسک کو بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ البدایہ النہایہ میں امام زہریؒ کا اصل عربی جملہ یہ ہے کہ جامع السنۃ الاولیٰ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پہلی سنت کو ٹوٹا دیا میرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے سنتِ اُمّی کے لفظ کو بدعت سے کیوں بدلا۔ اگر مولانا خود حضرت معاویہؓ کے اس مسک کو بدعت سمجھتے ہیں تو وہ اسے بدعت فرمائیں لیکن امام زہریؒ کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی گئی؟ ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔“ جواب اس کا یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ سب سے کوئی اعتراض ہی نہ تھا جیسے اٹھانے اور رفع کرنے میں وقت ضائع کیا جاتا۔ لیکن اب جبکہ مولانا محمد تقی صاحب نے اسی سے بسم اللہ کی ہے اور یہ بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ بعض دوسرے حضرات بھی ایک طرف خلافت و طوکت کی کوئی عبارت رکھتے ہیں، دوسری طرف حاشیے کے حوالہ جات میں سے کوئی ایک کتاب اٹھا کر کہتے ہیں کہ اس میں وہ عبارت بالفاظہ موجود نہیں ہے بلکہ دونوں میں لفظی و معنوی تفاوت ہے، پھر اس کے بعد زور سے کہا جاتا ہے کہ نہ صرف یہ حوالہ بلکہ دوسرے سارے حوالے نقل کرنے میں بھی غلطی کی گئی ہے، میں اس نوعیت کے سارے اعتراضات کی حقیقت واضح کیے دیتا ہوں۔

بات فی الاصل یہ ہے کہ ایک مصنف جب کسی دوسرے کی کتاب کا حوالہ دیتا ہے تو اس کے بالمعوم دو طریقے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ نازل اصل کتاب کا پورا حوالہ اس کے اپنے الفاظ میں من و عن دیتا ہے۔ اس صورت میں وہ ایک ہی مصنف کی ایک ہی کتاب کے ایک ہی مقام کا متعین حوالہ دیتا ہے اور ساتھ کوئی دوسرا حوالہ شامل نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں عام طور پر نقل کردہ عبارت یا اس کا ترجمہ بالکل الگ ممبر کر کے دیا جاتا ہے اور اس کے لیے منقول عبارت حوض میں خفی قلم سے واوین کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ اس طرح کا جو اقتباس دیا جاتا ہے اس میں نقل کا بالکل مطابق اصل ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور کوئی کمی بیشی یا حذف و اضافہ ہو تو اسے ناقابلِ جواز خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ انڈو اقتباس کا یہ ہے کہ ایک مصنف ایک سے زائد ماخذ کا حوالہ دے کر ماخذ مواد کو اپنی عبارت کا ایک جزء

بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ماخذ کا مکمل حوالہ بحینہ اصل الفاظ میں نقل کرنا ضروری ہوتا ہے، نہ ممکن۔ اسی لیے اذکر وہ حوالے کو قطعی طور پر علیحدہ و تمیز کرنے کے لیے حوض یا داوین وغیرہ کی مذکورہ بالا علامات و اندازے طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔ اس شکل میں متعین اور اخذ کرنے والے کے لیے یہ تو ضروری ہوتا ہے کہ وہ اصل مرجع کے باب، صفحہ وغیرہ کی نشان دہی کرے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اصل عبارت کا لفظ بلفظ اعادہ کرے اور ان میں ادنیٰ تغیر بھی نہ ہونے پائے۔ بلکہ یہ کافی ہوتا ہے کہ اصل مفہوم و مضمون کو فی الجملہ ادا کر دیا جاتے۔ یہ بالعمنی ترجمانی اس حالت میں اور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے جبکہ ایک سے زائد کتابوں کا حوالہ دینا مقصود ہو۔ وہاں اگر ہر کتاب کا ایک ایک کنڈیا اس کا ترجمہ الگ الگ درج کیا جانے لگے تو یہ ایک ایسی لاطائل تکرار ہوگی جو کھنسنے والے کو تھکا دے گی اور پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ اس لیے جہاں ایک سے زیادہ مراجع کا حوالہ دے کر بات کی جاتی ہے وہاں کھنسنے والا متقارب المعنی عبارتوں میں سے ایک مشترک روایت و حکایت (VERSION) اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ تالیف و تصنیف کا ایک جانا پہچانا اور معروف اسلوب ہے جس سے ہر کچھ اڑھا کتاب بین آشنا ہے۔ ہر حوالے کا بلا کم و کاست لفظی اعادہ تو اسی حال میں ممکن ہے جب کہ ہر سابق مستف نے بعینہ ایک ہی بات لکھی ہو۔ لیکن ایسا مکمل لفظی و معنوی توار و دو محالات میں سے ہے، حتیٰ کہ ایک ہی مصنف ایک ہی کتاب میں اگر ایک خیال و مضمون کو دو بار بیان کرتا ہے، تب بھی الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال یہی حافظ ابن کثیر اور ان کی کتاب "البدایہ" ہے جس کے دو حوالے مولانا مودودی نے مسئلہ زیر بحث میں دیئے ہیں اور جنہیں غلط ملکہ کر کے مدیر "البلاغ" نے بدعت و سنت اور پھر سنت اولیٰ اور سنتہ آخریٰ کی بحث پیدا کی ہے۔

مولانا محترم نے البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۲۳ اور جلد ۹ ص ۲۳۲ کے دو حوالے دیئے ہیں۔ مدیر "البلاغ" نے اپنی تازہ بحث میں پہلے البدایہ ج ۹ ص ۲۳۲ کا حوالہ دیا ہے مگر پوری عبارت نقل نہیں کی۔ یہ عبارت اور اس کا ترجمہ انہوں نے محرم ۱۳۸۹ھ کے البلاغ میں درج کیا تھا جسے میں انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

ہذا امام زہری فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ کے عہد میں نہ مسلمان

کافر کا وارث ہوتا تھا، نہ کافر مسلمان کا۔ پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مسلمان کو کافر کا

وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ بنایا۔ ان کے بعد خلفائے بھی یہی معمول رکھا۔ پھر جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا اور زید بن عبدالملک نے بھی ان کی اتباع کی۔ پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سنت پر عمل کیا، یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔

دوسرا مقام جس کا حوالہ خلافت و لوگت میں دیا گیا ہے وہ البدایہ ج ۸، ص ۱۳۹ کا ہے۔ اس کی پوری عبارت ”البلاغ“ کے تازہ شمارے میں تواریث کی بحث میں نقل ہو چکی ہے، البتہ آگے چل کر رسالے کے صفحہ ۸ پر جہاں ہماری غلطیاں پکڑنے کے شوق میں مولانا عثمانی صاحب نے اپنی عربی دانی و حدیث دانی کا عرب جمانے کی کوشش کی ہے، وہاں اس عبارت کو بھی مع ترجمہ دے دیا ہے اور وہ یہ ہے:

”ابو ایمان شعیب سے اور وہ زہری سے روایت کرنے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا نہ مسلمان کافر کا۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا۔ پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو امیہ نے کیا تھا۔“

پہلی اور دوسری سنت | اس ترجمے کے آخر میں ایک ٹکڑا جو بد حال الزہری سے شروع ہوتا ہے، وہ میں نے اس لیے یہاں حذف کر دیا ہے کہ وہ مسئلہ تواریث سے غیر متعلق ہے اور اس پر مفصل بحث الگ ہوگی۔ ترجمے کے شروع کا جو حصہ میں نے دیا ہے، اس کے متعلق پہلی بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے اور اس میں مدیر البلاغ نے اسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس کا الزام وہ دوسروں کو دیتے ہیں حالانکہ یہاں انہوں نے ایک ہی متیقن حوالہ دیا ہے اور اس کا متن بھی ساتھ موجود ہے۔ اصل عربی عبارت یہ ہے: وقال ابو ایمان

عن شعیب عن الزہری: مضت السنۃ ان لایرث الکافر المسلم ولا المسلم الکافر واول من

ورث المسلم من الکافر معاویۃ و قضی بذالک بنو امیۃ بعدہ حتی کان عمر بن العزیز فراجع

السنۃ و اعاد ہشام ما قضی بہ معاویۃ و بنو امیۃ من بعدہ۔ اب اس عربی متن کا ان کے اوپر والے

ترجمے سے مقابلہ کیا جاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے خط کشیدہ حصے کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے جو یہ ہونا

چاہیے تھا کہ ”پہلے پہل جنہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث بنایا، وہ معاویہؓ ہیں“ پھر دوسرے خط کشیدہ جملے فراجم السنۃ کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا ہے کہ ”انہوں نے یعنی حضرت ابن عبدالعزیز نے، پہلی سنت کو لٹا دیا، حالانکہ اس میں صرف سنت کا لفظ ہے، پہلی سنت کا لفظ نہیں ہے۔ اب مولانا مودودی اگر متعدد حوالوں کا ایک مشترک خلاصہ یا مفہوم بیان کرتے ہیں تو ان سے تو یہ مطالبہ ہے کہ ان کا ہر ہر لفظ ہر حوالے کا تحت اللفظ ترجمہ ہو، لیکن آپ ایک ہی حوالے کا لفظی ترجمہ کریں تو اس میں عذت و تصرف درست ہے!

ممکن ہے کہ یہاں مولانا عثمانی صاحب اپنے سہو قلم کا غدر پیش کریں یا کاتبُ البلاغ کے سراسر منڈھ دیں، لیکن راجع السنۃ میں السنۃ کا ترجمہ ”پہلی سنت“ کرنا یا کھنٹا بڑا معنی خیز ہے، کیونکہ اسی سے تو اپنے وہ مکتہ پیدا کیا ہے کہ پہلی سنت کے ساتھ یا اس کے بعد ”دوسری سنت“ بھی ہوتی ہے۔ حالانکہ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ السنۃ سے مراد ایک ہی سنت ثابتہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سنت ہے، اس کے مقابلے میں کوئی دوسری چیز جیسے آپ ”دوسری سنت“ کہتے ہیں، وہ وہ سنت نہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ حجرتا ثانیہ ہو۔ وہ سنت ہے تو بنو امیہ ہی کی سنت ہے (باستثنائے حضرت عثمانؓ و عمرؓ)۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس مقام پر الہدایہ میں لام تعریف کے ساتھ السنۃ ہی کا لفظ آیا ہے، اس لیے یہاں پہلی کے بعد دوسری سنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور دوسرا مقام جہاں الہدایہ میں السنۃ الاولیٰ کا لفظ آیا ہے، وہاں بھی السنۃ الاخریٰ کا لفظ موجود نہیں، بلکہ وہاں آگے یہ الفاظ ہیں: فلما قام ہشام اخذ بسنۃ الخلفاء حبلیا ترجمہ آپ نے بھی یہی کیا ہے کہ ”جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سنت پر عمل کیا“ ان خلفاء سے مراد ہرگز خلفائے راشدین نہیں کیونکہ ان کی سنت کو تو امیر معاویہؓ نے بدل دیا۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شک باقی رہتا ہے کہ جس شے کو آپ دوسری سنت کہہ رہے ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے اربعہ کی سنت نہیں، بلکہ خلفائے بنی امیہ کی ہے اور جیسا کہ میں پہلے مضمون میں بتا چکا اور مثالیں دے چکا، ان خلفاء کی سنتیں تو بے شمار ہیں۔ اگر حمایت کرنی ہے تو پھر ان ساری سنت ہائے ثانیہ کی کیجیے اور دفاع سنت کا پورا پورا ثواب لیجیے۔

پھر مدیر البلاغ کے یہ الفاظ بھی عجیب ہیں کہ ”مولانا نے ”سنت اولیٰ“ کے لفظ کو بدعت سے کیوں بدلا، مولانا نے سنت یا سنت اولیٰ کے الفاظ کو بدعت کے لفظ سے نہیں بدلا، بلکہ سنت کو لٹا دینے کا مفہوم

ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ بدعت کو ختم کیا۔ مولانا عثمانی کے نزدیک ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے؛ حالانکہ دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں سنت کا بحال کرنا اور بدعت کو ختم کرنا بالکل ہم معنی ہے اور بدعت کا خاتمہ کیے بغیر سنت لوٹ ہی نہیں سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ارشاد مبارک ہے کہ سنتِ ثنی ہے تو بدعت اس کی جگہ لیتی ہے، اس لیے احیائے سنت کا مطلب بدعت کو ختم کرنے کے سوا اور کیا ہے؟ ”مدیر البلاغ“ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب نے جو حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بدعت قرار دیا ہے، وہ درست نہیں، اس لیے کہ یہ فقہی اجتہاد تھا جس کی بنیاد ایک مرفوع حدیث پر ہے۔ میں اس اعتراض کا نہایت مفصل و مدلل جواب پہلے سلسلہٴ مضامین میں دے چکا کہ یہ فعل نصوص کتاب و سنت اور تعاملِ خلافتِ راشدہ سے عین معارض و متضاد ہے، اس لیے یہ اجتہاد نہیں ہے اور جس حدیث کو اس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے اس کا سرے سے وراثت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور وہ دوسری احادیثِ صحیحہ کے مخالف ہے۔ اب میری ساری بحث سے عربِ نظر کرتے ہوئے ”البلاغ“ نے پھر اپنی بات کو دہرا دیا ہے کہ یہ دوسرا مسلک بھی بے بنیاد نہیں ہے اور یہ قیاسِ غلط ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیاسی اغراض کے لیے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بات مولانا مودودی نے حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں کہی بلکہ ”دورِ ملکیت“ کے متعلق ایک عام بات کہی ہے اور عام و خاص میں ہر حال فرق ہے۔ باقی یہی بات کہ یہ حضرت معاویہؓ کا اجتہاد ہے، تو جیسے سے اجتہاد ہی مان لیجیے۔ اگر امیر معاویہؓ اس اجتہاد پر ذاتی طور پر عمل فرماتے یا بطور اپنے انفرادی مسلک کے اسے دوسروں کے سامنے بیان کر دیتے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جملہ بحث و اسکاں تو اس امر میں ہے کہ کیا ایسے انفرادی اجتہاد کا مکلف و پابند دوسروں کو بھی بنایا جاسکتا ہے اور سنتِ ماضیہ کو ٹٹا کر اسے قانونِ ملکی کے طور پر پوری اسلامی سلطنت میں نافذ کیا جاسکتا ہے؟ جبکہ یہ نص صریح سے کھرا رہا ہو؟ یہ تو اصولِ فقہ کا ایک عام مسئلہ ہے کہ جائز و مباح بلکہ مندوب تک کا لزوم و وجوب اسے بدعت کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔

لے کر یا کہ یہاں عثمانی صاحب نے تسلیم کر لیا کہ مولانا مودودی نے امام زہری کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی بلکہ خود اعادہ سنت کو خاتمہ بدعت سے تعبیر کیا، حالانکہ پہلا اعتراض یہ تھا کہ امام زہری کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی جواہوں نے نہیں کہی تھی۔

صحابہ کرامؓ اور فقہاء کے نفروں | اس جگہ مدیر البلاغ نے بعض صحابہ کرام کے نفروں کو گنوا ہے اور ان کو امیر معاویہ کے جوازِ مسک کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ ”ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ مسک مشہور معروف ہے کہ وہ ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ میں سے کوئی ایک بھی اس میں ان کا ہمنوا نہ تھا۔ سب کے نزدیک ان سے اس مسئلے میں اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔ اچھا، اب فرض کیجیے کہ حضرت ابو ذرؓ مسندِ اقتدار پر فائز ہو جاتے اور وہ اپنے اسی مسک کو پوری مملکت اسلامیہ میں قانوناً نافذ کر دیتے کہ کوئی شخص ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس نہ رکھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک حرام ہے۔ اب مجھے مولانا عثمانی صاحب بتائیں کہ وہ اس مسک کے رواج و نفاذ کی اسی زور کے ساتھ تائید کریں گے یا نہیں جس طرح وہ امیر معاویہ کے مسک کی کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ امیر معاویہ کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ ”جب وہ امیر بن گئے، تب بھی ان کی اہلیتِ اجتہاد ختم نہیں ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی فقہیہ مجتہد امیر بن جائے تو اُسے محض امیر ہونے کے جرم میں اجتہاد سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا“ اگر امیر معاویہ کے بارے میں یہ امر ظاہر ہے تو پھر حضرت ابو ذرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے معاملے میں بھی ظاہر ہے۔ حضرت امیر معاویہ کے جو فضائل و مناقب ہیں اور جنہیں ”البلاغ“ میں بیان کیا گیا ہے، حضرت ابو ذرؓ کے فضائل اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ پھر وہ بھی اپنے مسک کے حق میں آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات پیش کرتے تھے جو ان دنوں سے زیادہ صحت کے ساتھ مروی ہیں جو امیر معاویہ کے حق میں پیش کی جاتی ہیں اور حضرت ابو ذرؓ کے استنباط و اجتہاد میں کلفت یا خطا اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا کہ حضرت معاویہ کے حق میں پیش کیے جانے والے اجتہاد میں ہے۔

مدیر البلاغ نے شروع مضمون ہی میں یہ شکایت بھی کی ہے کہ ”بعض جو شیخے حضرات نے ہمیں سوشلسٹ ایک قرار دیا“ معلوم نہیں یہ حضرات کون تھے اور اس تازہ نمبر کی اشاعت سے پہلے انہوں نے کس بنیاد پر ایسا بے بنیاد الزام تراشا، لیکن کچھ جو شیخے یا پھر سوشلزم کے حضرات اگر امیر معاویہ کے حق میں ویسے جملے والے ”البلاغ“ کے سارے دلائل کو حضرت ابو ذرؓ کے فقہی مسک اور اس کے بعد پھر سوشلزم کے حق میں استعمال

کرنے لگیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر البلاغ کیوں اس پر شکی ہوں؟ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ آپ کو تو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت ابوذرؓ کا مسک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے، مگر دوسرا شخص یہی بات حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں کہہ دے تو یہ سب و شتم ہے۔

اس کے بعد مدیر البلاغ، امام شافعیؒ کا یہ مسک بیان کرتے ہیں کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ اگر کوئی ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا بان بوجھ کر چھوڑ دے، تب بھی ذبیحہ حلال ہوتا ہے اور پھر پوچھتے ہیں کہ کیا کسی نے اس مسک کی وجہ سے امام شافعیؒ پر بدعت کا الزام عائد کیا ہے؟ یہاں پھر میں بھی پوچھتا ہوں کہ اگر امام شافعیؒ امیر المؤمنین ہوتے اور وہ اسی مسک کو پوری اُمت میں قانوناً نافذ کر دیتے تو کیا بدعت کی تعریف میں نہ آتا، یہ سوال میں صرف البلاغ کے استدلال کی غلطی اور خامی واضح کرنے کے لیے کر رہا ہوں، ورنہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی فقیہ یا مجتہد نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ اس کا کوئی انفرادی مسک دوسروں پر بے جبر یا بذریعہ اقتدار نافذ العمل ہو۔ امام مالکؒ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ہارون الرشید نے ان کے مؤطا کو قانون ملکی کی اساس بنانے کا ارادہ کیا تھا مگر امام مالکؒ نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا تھا۔ سلاطین متاخرین میں سے بھی بہت سے شافعی المسک تھے لیکن انہوں نے اپنی سلطنت میں یہ قانون یا قاعدہ کبھی راج نہیں کیا کہ جو شخص دانستہ ذبیحہ پر بسم اللہ نہ پڑھے، اس کا ذبیحہ ہر دوسرے شخص کے لیے حلال ہے۔ اسی طرح اگر حضرت امیر معاویہؓ خلیفہ بننے پر زور بیٹ مسلم من الکافر کو قانون نہ بناتے اور اپنے انفرادی اجتہاد کی حیثیت میں اس کے قائل رہتے، تو اس کا شمار بدعت میں نہ ہوتا۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہونے سے قبل اور بعد میں بھی اس مسک پر تھے کہ جنہی جینک پانی سے طہارت غسل نہ کر لے، وہ تیمم سے نماز کسی عذر کی بنا پر نہیں پڑھ سکتا۔ خلافت پر فائز ہونے کے بعد ان کا حضرت عمار بن یاسر سے اس مسئلے میں مذاکرہ و مباحثہ بھی ہوا، اس کے باوجود وہ اپنے ذاتی مسک پر قائم رہے، مگر انہوں نے حضرت عمارؓ یا کسی دوسرے مسلمان پر اپنے مسک کی پیروی لازم نہ کی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں شوہری کا نظام پوری طرح قائم و کار فرما تھا اور بالعموم اہم ملکی و اجتماعی مسائل یا سہی مشاورت کے بعد طے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اجماع کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت خلفاء راشدین کا نام دے کر یا دوسرے لفظوں میں اسے اپنی سنت کا ضمیمہ و تتمہ قرار دے کر اس

کی پیروی کا بھی حکم دیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا عام طریقہ یہی رہا کہ پیشِ آمدہ مسائل میں نہ صرف شورائی سے مشورہ لیتے تھے، بلکہ یہ اعلانِ عام کرتے تھے کہ فلاں مسئلے میں اگر کسی کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی قوی و فعلی حدیث ہو تو آکر ہمیں بتائے، اس لیے اس عہدِ سعادت میں اس امر کا امکان بہت کم تھا کہ خلفاء کسی اپنے انفرادی مسلک کا نفاذ عام کرتے۔ بعد کے ادوار میں یہ صورت باقی نہ رہی اور ایسے فیصلے نافذ العمل ہوئے جنہیں اب خواہ مخواہ سنت کا درجہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ یہ پہلی سنت نہ سہی، دوسری سنت تو ہے، حالانکہ جس حدیث میں ارشادِ نبویؐ عدیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین وارد ہے، اسی میں آگے دیتا کہ وہ محدثات الامور مروی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ سنتِ نبوی اور سنتِ خلفاء راشدین کے خلاف ہوگا، وہ محدثات کے زمرے میں آئے گا اور جس طرح سنت سے منکس کی تاکید فرمائی گئی، اسی طرح محدثات سے بچنے کی بھی تاکید فرمائی۔

امام شافعیؒ کے ذکر کے بعد مدیترہ البلاغ نے "الاعتصام" (دشاد طیبی) کی عبارت نقل کی ہے جس سے ثبوت کرنا مقصود ہے کہ بدعت کا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جس میں خواہشِ نفسانی کی اتباع میں تخریفِ دین کا ارتکاب کیا جائے۔ حالانکہ امام شافعیؒ نے بدعت کی اصل تعریف میں ہر اس رستے کو داخل کیا ہے جو کسی اصل شرعی پر مبنی نہ ہو، البتہ اگر جہل و اتباع ہوئی بھی اس کے ساتھ شامل ہو، تو وہ بدعتِ مذمومہ قرار پاتی ہے۔ میں نے امیر معاویہؓ کے فیصلے کو دوسری سنت قرار دیتے جانے پر جو لکھا تھا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آج کل فضل الرحمن اور پرینز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکزِ ملت جو کچھ طے کر دے وہی سنت ہے، اس کے جواب میں مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ بات تو یہ کہی جا رہی ہے کہ امیر معاویہؓ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور امیر ہوجانے کے بعد بھی یہ حق سلب نہیں ہو سکتا۔ میں اور اس معاوضے کو صاف کر چکا کہ سوال مطلق حقِ اجتہاد کا نہیں بلکہ ایسے اجتہاد کو پوری امتِ اسلامیہ پر قانوناً نافذ کر دینے کا ہے جو کسی شرعی اصل پر مبنی نہیں۔ اگر فضل الرحمن صاحب یا پرینز صاحب کے مرکزِ ملت کا ذکر الجھن کا باعث ہے تو میں محمود احمد عباسی صاحب کی مثال پیش کرتا ہوں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ توریت اور دیت کا قاعدہ جب مدتِ مدیترہ تک خلفائے بنی امیہ نے پوری مملکت میں قانونِ ملکی کی حیثیت سے نافذ و جاری رکھا تو پھر یہ

بلاشک و شبہ سنت ہے، اس کے سنت ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے؟ کیا مولانا عثمانی صاحب اس استدلال سے متفق ہیں؟

امیر معاویہؓ کے فیصلے پر قضیہ محدثہ کا اطلاق | حیرت ہے کہ البلاغ میں پھر مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں اس کی کوئی مثال پیش کروں کہ کسی نے امیر معاویہؓ کے اس فعل کو بدعت قرار دیا ہو اور مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ چودہ سو سال کے عرصے میں کوئی ایک فقہی ہماری نظر سے نہیں گزرا جس نے اسے بدعت قرار دیا ہو۔ میں اپنی سابق بحث میں منقد قدیم و جدید اہل علم کے اقوال نقل کر چکا ہوں جنہوں نے امیر معاویہؓ کے مختلف اعمال کے لیے بدعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۹۰ھ میں احناف کے مشہور محدث و فقہیہ الیوم الجصاص کی کتاب احکام القرآن کے ایک مفصل قول کا حوالہ دیا ہے جس میں حضرت مرفق نامی نے حضرت معاویہؓ کے اس فیصلہ کو ریش پر ریشے سخت انداز میں تنقید کی ہے اور قاضی شریح نے اور خود الجصاص نے بھی اس تنقید کی تائید کی ہے۔ میں نے وہاں اس بحث کے کچھ عربی حصے مع ترجمہ نقل کیے تھے اور ابقیہ کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ اب اگر میں دوبارہ پوری عبارت کو ترجمے کے ساتھ نقل کروں تب تو یہ بہت موجب طوالت ہوگا، اس لیے میں یہاں اس کا صرف اردو ترجمہ دیتا ہوں :

”ابن شہاب زہری داؤد سے اور وہ مسروق سے راوی ہیں کہ مسروق نے فرمایا کہ اسلام میں اس سے زیادہ عجیب اور نرال فیصلہ نہیں کیا گیا جیسا کہ امیر معاویہؓ نے کیا (صاحب الحدیث فی الاسلام قضیہ | عجب من قضیة قضاها معاویة) کہ آپ مسلمان کو یہودی اور نصرانی کا وارث قرار دیتے تھے اور یہودی و نصرانی کو مسلمان کا وارث نہیں بناتے تھے۔ اہل شام نے اسی کے مطابق فیصلے کیے جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوتے تو آپ نے پہلے طریقے کو دوبارہ ٹوٹا دیا۔ اور شعبی سے روایت ہے کہ امیر معاویہؓ نے زیاد کو تحریر کیا کہ وہ مسلمان کو کافر کا وارث بناتے۔ زیاد نے قاضی شریح کو بلا کر ایسا کرنے کا حکم دیا۔ شریح اس سے پہلے مسلمان کو کافر کا وارث نہیں بناتے تھے۔ جب زیاد نے ایسا حکم دے دیا تو انہوں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا مگر جب وہ ایسا فیصلہ کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ یہ امیر المؤمنین کا فیصلہ ہے حالانکہ زہری علی بن حسین سے، وہ

عمر بن عثمان سے اور وہ حضرت اُسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”دو مختلف ملتیں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے اور دوسری روایت میں ہے کہ ”مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا اور عمر بن شعیب ، اپنے والد سے اور وہ داد سے روایت کرتے ہیں کہ دو مذاہب کے پیروں میں باہمی نوارث نہیں ہو سکتا۔ یہ روایات مسلمان کو کافر کا یا کافر کو مسلمان کا وارث قرار دینے سے منع کرتی ہیں۔ اس کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے۔ پس اس طرح دو اہل مذہب کے مابین تولد ساقط ہونے کا حکم ثابت ہو گیا جہاں تک حضرت معاذ والی روایت کا تعلق ہے وہ امیر معاویہ کے اس قول کی تائید نہیں کرتی۔ انہوں نے الایمان یزید ولا ینقض کی صحت ایک تاویل کی ہے اور تاویل نص اور توفیق وحی پر قاضی نہیں ہو سکتی۔ تاویل کو امر منصوص کی طرف لوٹایا جائے گا اور نص کی مخالفت پر نہیں بلکہ اس کی موافقت پر محمول کیا جائے گا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ”ایمان بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں“ اس مراد پر مشتمل ہوگا کہ جو اسلام لے آیا اُسے اسلام پر رہنے یا جانے کا اور جو اسلام سے خارج ہوگا اُسے واپس لانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر حضرت معاذ کی تاویل اور اس احتمال کو لیا جائے تو اسے حضرت اُسامہ کی اس حدیث کے موافق کرنا واجب ہو جاتا ہے جس میں کافر و مسلم کے مابین نوارث ممنوع ہے کیونکہ تاویل و احتمال کے بل پر نص کو رد کرنا جائز نہیں، اور احتمال کے ذریعے سے کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ایک مشکوک چیز ہے اور اثبات حکم کے معاملے میں خود دلالت کی محتاج ہے۔ پس اس سے احتجاج دست بردار ساقط ہو گیا۔

اور مسروق کا جو یہ قول ہے کہ اسلام میں اس سے زیادہ انکو فیصلہ نہیں ہوا جو امیر معاویہ نے تو ریثتِ مسلم من الکافر کے مسئلے میں کیا ہے، یہ قول اس فیصلے کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ فیصلہ اعداء فی الاسلام ہے اور ان کے اس فعل سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت معاویہ کے اس فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ امیر معاویہ کے فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا تو ان کے

یہ یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اپنے پیش روؤں کی مخالفت کریں۔ بلکہ ان کے سامنے حضرت معاویہؓ کا قول سا قطب ہے

اور اس کی تائید داؤد بن ابی ہند کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں میں امر اول کہ

لو ما دیا“ (احکام القرآن، ابوبکر احمد بن علی الجصاص ج ۲، ص ۲۷۷، المطبعت البہیہ مصر، ۱۳۲۷ھ)

ممکن ہے کہ یہاں مدیر البلاغ پھر یہی فرمائیں کہ یہاں بدعت کا لفظ نہیں آیا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا

ہے کہ مکمل محدث بدعت (ہر امر محدث بدعت ہے)، نیز آنحضرتؐ نے فرمایا: شد الامر محدثا تھا (سب سے بڑے

امور محدثات ہیں)، حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: من احدث فی امرنا ما لیس منہ فهو

سرد (جس نے امر میں نئی بات نکالی جو اس میں نہیں، وہ بات مردود ہے)۔

ابن قدامہ کا قول [آخر میں البلاغ“ میں میرے“ ایک اور مغالطہ اور بولچہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ

یہاں نے المغنی ج ۷، ص ۱۷۱ کے حوالے سے لکھا تھا کہ ”ابن قدامہ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد بن حنفیہ، علی بن حسین، سعید

بن المسیب، مسروق، عبداللہ بن معقل، شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ

انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا۔ اس کے بعد ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ اس کی نسبت ان کی جانب قابل اعتبار

نہیں ہے“ مولانا عثمانی صاحب فرماتے ہیں ”اس سے پہلے ابن قدامہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت معاویہؓ

اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول مروی ہے کہ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث بنایا۔ اب اگر دوسرے حضرات کی جانب

اس قول کی نسبت مشکوک ہے تو ان تینوں اصحاب کی جانب بھی غیر موقوف ہونی چاہیے کیونکہ ابن قدامہ نے سب کے

بارے میں یہ کہا ہے کہ لیس بموجب موقوف بدعت عثمانی صاحب کے نزدیک میں نے یہ مغالطہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ

مولانا مودودی نے جو امیر معاویہؓ کو بدعت کا مرتکب بنایا ہے، اس کی تصدیق کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودی نے یہاں ”بدعت“ کا لفظ ”غیر مسنون وغیر مشروع“ کے معنوں میں

استعمال کیا ہے اور ان معنوں میں اس فعل کے بدعت ہونے، نہ ہونے یا اس کی نسبت کے موقوف وغیر موقوف ہونے

کا انحصار صرف المغنی کی اس عبارت پر نہ تھا کہ میں یہاں مغالطہ انگیزی ضروری سمجھتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ

پہلے ابن قدامہ نے ایک جگہ لکھ دیا ہے... سے شروع کیا ہے، پھر انہوں نے حجتی سے دوسرا جملہ شروع کیا ہے۔ اس سے

متصلاً و لیس بموجب موقوف بدعت لکھا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ لیس کا عطف حجتی پر ہے کیونکہ یہی جملہ

لے ان دونوں جملوں کو مطبوعہ کتاب میں وقف نام (۱۰) کے ذریعے سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ بھی کر دیا گیا ہے۔

قریب تر ہے، اسی طرح عنہم کا مرجع بھی اسی قریب کے مجھے میں ہے اور ولیس بموثوق بد عنہم کا تعلق دوسرے ہی مجھے سے ہے۔ تاہم مجھے اپنی بات پر اصرار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس مجھے کا ربط دونوں پہلے جملوں سے ہو اور ابن قدامہ کی مراد یہی ہو کہ ان سارے حضرات کی جانب اس مسلک کی نسبت مشکوک ہے۔ اگر فی الواقع اس معنی میں یہ بات صحیح ہوتی تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ کے متعلق یہ قول اس کثرت سے حدیث، آثار، تاریخ اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ محض ابن قدامہ کے ایک ذومعنی فقرے کے بل پر ان ساری کتابوں میں مروی اقوال کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک حضرت معاذ کا تعلق ہے میں پھر یہی کہوں گا کہ یہ ان کا ذاتی نظریہ ہو گا اور ممکن ہے انہوں نے کسی موقع پر اس کے مطابق عمل کیا ہو، لیکن امیر معاویہؓ نے امیر المؤمنین کی حیثیت سے جس طرح اس کا نفاذ و اجرا کیا اور بنو امیہ کے دور میں جس طرح یہ رائج رہا، وہ اس واقعہ کی صحت کو شک و شبہ سے بالاتر بنا دیتا ہے اور اس میں اعتراض کا پہلو بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مدیر البلاغ نے یہ بھی کہا ہے کہ ابن قدامہ نے دلیل میں امام احمد کا قول نقل کیا ہے کہ ”لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں“ جس سے واضح ہے کہ توریث والے اس قول کی نسبت کسی کی طرف بھی درست نہیں۔ مگر یہاں خود مدیر موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے صاحب المغنی نے امام احمد کا جو قول نقل کیا ہے اس کا معنا یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث بنانے والا نظریہ و عمل اب امت میں متروک و مطرود ہو چکا ہے اور کوئی عالم و فقیہ اب اس کا قائل و عامل نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی اس بحث کا عنوان یہ ہے: ”ولا یرث مسلم کافرًا ولا کافر مسلمًا۔“

چند مزید اقوال جہاں تک امیر معاویہؓ کے اس فیصلے اور فرمان کا تعلق ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث بنا یا جائے، سب نے امیر معاویہؓ سے اس کا صدارت میں تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام ابن خزم نے بھی اٹھلی، ج ۹ ص ۳۰۲ پر مشہد ۴۴۲ کے تحت پہلے عنوان یہی قائم کیا ہے کہ: لا یرث المسلمہ الکافر ولا الکافر المسلمہ۔ المذند، پھر معاذ بن جبل اور بعض دوسرے حضرات کی طرف یہ مسلک منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد خاص طور پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہو عن معاویۃ

ثابت ریہ مسلک امیر معاویہؓ سے ثابت ہے۔) ابن خزم کی فقہی آراء سے کسی کو اختلاف ہوتا ہے، مگر حدیث آثار میں ان کی تحقیق مسلم ہے۔ ان کا دوبارہ خاص طور پر یہ کہنا کہ ہوتا ہے عن معاویہؓ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس فیصلے کی نسبت امیر معاویہؓ کی طرف قطعی طور پر غیر مشتبہ ہے۔ داؤد ابن ابی ہند اور مسروق کے اس مضمون کے اقوال جو اد پر امام ابو بکر جصاصؒ کی بحث میں بھی گزر چکے ہیں وہ ابن خزم نے بھی نقل کیے ہیں اس کے بعد وہ امام احمد کا وہی قول نقل کرتے ہیں جو ابن قدامہ نے درج کیا ہے اور آخر میں ابن خزم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مزید حدیث حضرت جابرؓ سے نقل کی ہے کہ لا یرث المسلمہ النضوانی (مسلمان کسی عیسائی کا وارث نہیں ہو سکتا)۔

الخصاص اور ابن خزم کے بعد اب میں ملا علی قاری کی مرقاة شرح مشکوٰۃ کا ایک حوالہ پیش کرنا ہوں۔
البراب الفرائض میں حدیث وعن اُسامة بن زید قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم (متفق علیہ) کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو حضرات مسلمان کی کافر سے تو ریش کے قائل ہیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ الاسلام یعلو و لا یعلیٰ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

و حجة الجمهور هذا الحديث الصحيح
والمراد من حدیث الاسلام فضل الاسلام
علی غیرہ و لیس فیہ تعوض للمیراث فلا
یندرک النص الصویح -

مسلک جمہور کے حق میں وہی حدیث صحیح حجت ہے کہ
نہ مسلمان کافر کا وارث ہے، نہ کافر مسلمان کا (اور یہ
الاسلام یعلو و لا یعلیٰ سے مراد اسلام کی غیر
اسلام پر فضیلت ہے۔ اس دوسری حدیث کا مرث
سے کوئی تعلق نہیں۔ پس نص صریح کا ترک جائز نہیں۔

ربیع الاول ۵۹ھ کے ترجمان میں فتح اباری سے میں ابن حجر کا قول نقل کر چکا ہوں جو اسی منہوم کا حامل ہے اور جس میں مسلمان کو کافر کا وارث بنانے کو معارضتہ النسل سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کے حق میں پیش کی جانے والی روایت کے بارے میں فرمایا ہے: بل هو محمول انہ یفضل غیرہ من الادیان دلائل تعلق لہ بالارث (اس حدیث کا وارثت کے مسئلے سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

اسلام دوسرے ادیان پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی میں پہلے لکھ چکا کہ یہاں سوالی حضرت امیر معاویہؓ یا کسی دوسرے صحابی یا تابعی کی ذات کا نہیں اور اس امر کا بھی نہیں کہ تو ریث مسلم من الکافر کے قائل یا فاعل کون بزرگ ہیں اور ان کی تعداد کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نص صریح کا ترک اور اس کی مخالفت و معارضت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ اور محدث علی افشاری نے فرمایا۔ نص صریح سے مراد نص قرآنی بھی ہے اور نص حدیث و سنت بھی ہے اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے اجتہاد یا دوسری سنت کہہ کر اس کی تائید میں زور لگاتا رہے۔ جیسا کہ مدیر "البلاغ" نے فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ نظریات کے معاملے میں جبر نہیں کیا جاسکتا۔

(باقی)

(بقیہ مطبوعات)

یہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کی ہیں۔ کتاب بڑی فکر انگیز ہے اور اس کی موجودہ حالات میں اشاعت ضروری ہے۔ طباعت و کتابت کا معیار اگر اس سے بہتر ہوتا تو یہ مناسب تھا۔